ق احمد

زاویہ

اشفاق احمد

گڈریا، ایک محبت سو افسانے، وداعِ جنگ، ایک ہی بولی، صُبحانے فسانے، توتا کہانی، بند گلی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمان سرائے، من چلے کا سودا، بابا صاحبا، سفر در سفر، اُچے بُرج لاہور دے، ٹاہلی تھلے، حسرتِ تعمیر، جنگ بجنگ، زاویہ، سفرِ مینا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدہ، شاہلا کوٹ، کھیل تماشا، گلدان، کھٹیا وٹیا، دھینگا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا،

بانو قدسیہ

راجہ گدھ، شہرِ بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آسے پاسے، دوسرا قدم، آدھی بات، دست بستہ، حوّا کے نام، سورج مکھی، پیا نام کا دیا، آتشِ زیرِ پا، امربیل، بازگشت، مردِ ابریشم، سامانِ وجود، ایک دن، پُروا، موم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تماثیل، فُٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابلِ ذکر، کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زاویہ

اشفاق احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

1- ''بہروپ''	7
2- بچوں کی نفسیات	14
3- ناشکرا انسان	21
4- مایوسی	28
5- صاحبانِ علم	34
6- ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں	41
7- دیے سے دیا	47
8- بابا کی تعریف	55
9- کلچر	62
10- تعریف و توصیف	69
11- اندر کی تبدیلی	76
12- محبوب کون؟	84
13- اللہ کا نظام	92
14- آروائے خان	100
15- اینڈریو	107
16- گوماان ہالینڈ	115
17- احکامِ الٰہی	122
18- ایک معصوم بیٹی کی کہانی	129
19- موت کی حقیقت	137
20- شیئرنگ	143
21- انسان کو شرمندہ نہ کیا جائے	150

22- اندر اور باہر کی شخصیت کی میچنگ 157

23- مکّی 164

24- انا کی ٹُھ 170

25- کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں 177

26- تائی کریم بی بی اور الیگزینڈر فلیمنگ 184

27- حضرت صالح کی اونٹنی اور پاکستان 192

28- We don't live in present but in future and past 198

29- دُعا 205

30- قول اور عمل 212

31- بابا جناحؒ 219

32- احترامِ آدمیت 225

33- ریفریجریٹر زندگی 232

34- Snap Shot 239

35- قول اور نفس 246

36- انسان اپنی خواہش پوری ہونے کی راہ میں خود حائل ہو جاتا ہے 253

37- حقوق العباد کا بوجھ 260

38- خواب اور معجزہ 265

39- زبانی دعوے اور ضمیر کی آواز 269

40- دوستی اور تاش کی گیم 275

41- انسانی عقل اور رضائے الٰہی 281

42- اللہ کا فضل 287

43- صبر، ڈسپلن اور آزادی کشمیر 293

44- بابے، جسم اور خیال کا کِلا 298

45- چیزوں کی کشش اور ترکِ دنیا 303

46- ''دل کا معاملہ'' 309

47- بابا رتن ہندی کا سفرِ محبت 315

''بہروپ''

یہ ایک بھری برسات کا ذکر ہے۔ آسمان سے ڈھیروں پانی برس رہا تھا اور میری کیفیت اُس طرح تھی کہ جیسے میرے دل کے اندر بارش ہو رہی ہے' کچھ ایسا ہی مینہ بستی کے اوپر بھی برس رہا تھا۔ میں تھوڑا سا زخم خوردہ تھا۔ اس زخم کا مداوا میرے پاس نہ تھا' ماسوائے اس کے کہ میں ڈیرے پر چلوں اور اپنے بابا کی خدمت میں اظہار کروں۔ بات یہ تھی کہ میرے ایک بہت ہی پیارے دوست' جو میرے ساتھی بھی تھے، وہ افسانہ نگار تھے اور کالم بھی لکھتے تھے۔ انہوں نے کالموں میں میری بڑی کھچائی کی تھی۔ اور جب کالم نویس رگیدتا ہے تو جس کی کھچائی ہوتی ہے اس کے پاس کوئی اخبار نہیں ہوتا جس میں وہ جواب الجواب لکھ سکے۔ وہ بے چارہ غم زدہ ہو کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی انہوں نے کچھ ایسا ہی کیا تھا اور تابڑ توڑ تین چار سخت حملے کیے تھے۔

میں اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے ڈیرے پر چلا گیا اور بابا جی سے کہا، ''میں بڑا دکھی ہوں اور اس بات کی مجھے بڑی تکلیف ہے۔ اس شخص نے جو میرے بظاہر دوست ہیں، ہم سے محبت کے ساتھ ملتے ہیں اور ٹی ہاؤس میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے ہیں اور لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اس طرح کی کارستانی میرے لیے کر سکتا ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟''

انہوں نے کہا: ''اوہ پت! آپ اس کو سمجھے نہیں، یہ بڑی سمجھ داری کی بات ہے۔ دو صوفی تھے۔ ایک بڑا صوفی ٹرینڈ اور ایک چھوٹا صوفی انڈر ٹریننگ۔ چھوٹے صوفی کو ساتھ لے کر بڑا صوفی گلیوں، بازاروں میں گھومتا رہا۔ چلتے چلاتے اس کو لے کر ایک جنگل میں چلا گیا۔ جیسے کہ میں نے پہلے عرض کی، بڑی تابڑ توڑ بارش ہوئی تھی، جنگل بھیگا ہوا تھا اور اس جنگل میں جگہ جگہ لکڑیوں کے ڈھیر تھے۔ پتوں کے، شاخوں کے انبار تھے۔ اس بڑے صوفی نے دیکھا کہ شاخوں اور پتوں کے ڈھیر میں ایک سانپ کچھ مرجھایا ہوا، کچھ سنگھڑایا ہوا پڑا ہے۔ وہ پہلے آگ کی حدت سے زخم خوردہ تھا اور پھر اس پر جو بارش پڑی تو وہ زندہ سانپوں میں سے ہو گیا۔ صوفی کو بڑا ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سانپ کو اٹھا

لیا۔ چھوٹے صوفی نے کہا 'حضور کیا کرتے ہیں، سانپ ہے موذی ہے' اس کو اٹھایا نہیں کرتے۔' انہوں نے کہا: 'نہیں بے چارہ ہے، مجبور ہے، زخمی ہے، زخم خوردہ ہے اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی کچھ غور و پرداخت کرنی چاہیے۔' تو وہ سانپ کو ہاتھ میں لے کر چلے۔ پھر دونوں باتیں کرتے کرتے کافی منزلیں طے کرتے گئے۔ جب ٹھنڈی ہوا لگی، جھولتے ہوئے سانپ کو' تو اسے ہوش آنے لگا اور جب ہوش آیا تو طاقتور ہو گیا۔ طاقتور ہو گیا تو اس نے صوفی صاحب کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ جب ڈسا تو انہوں نے سانپ کو بڑی محبت اور پیار کے ساتھ ایک درخت کی جڑ کے پاس رکھ دیا کیونکہ وہ اب ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ اب یہ یہاں پر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ریوائیو (Revive) کر لے گا۔ جہاں بھی اس کا دل ہوگا، چلا جائے گا۔ چھوٹے صوفی نے کہا: 'دیکھیں سر! میں نے کہا تھا نا کہ یہ موذی جانور ہے، آپ کو ڈس لے گا۔ پھر کیوں ساتھ اٹھا کے لے جا رہے ہیں؟ آپ تو بہت دانشمند ہیں، مجھے سکھانے پر مامور ہیں۔' تو انہوں نے کہا: ''ڈسا نہیں اس کے شکریہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ سانپ اسی طرح شکریہ ادا کیا کرتے ہیں۔'' ''یہ جو تمہارے خلاف لکھتا ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ تم ناراض نہ ہو۔''

میرے دل پر بڑا بھاری بوجھ تھا، دور ہو گیا اور میں بالکل ہلکا پھول ہو گیا۔ تو خواتین و حضرات! یہ ڈیرے، یہ خانقاہیں یا جن کو تکیے کہہ لیں، یہ اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ دل کا بوجھ جو آدمی سے خود اٹھائے نہیں اٹھتا، وہ ان کے پاس لے جائے۔ اور ''بابے'' کے پاس جا کر آسانی سے سمجھ میں آنے کے لیے عرض کرے۔ فرض کریں ماڈرن دنیا میں کسی قسم کا ایک ڈیرہ ہو، جس میں کوئی سائیکی ایٹرسٹ (Psychiatrist) بیٹھا ہو، لیکن وہ فیس نہ لے' یا سائیکالوجسٹ ہو جس کے پاس وہ بیچ نہ ہو جس پر لٹا کر Analysis کرتے ہیں، بلکہ بچھانے کے لیے صف ہو۔ اس پر ایسا سامان ہو کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ تو ان ڈیروں کو' ان تکیوں کو شمالی افریقہ میں' الجزائر میں' تیونس میں ''زاویے'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کو ''زاویہ'' کہتے ہیں۔ کچھ ''رباط'' بھی کہتے ہیں وہاں پر، لیکن زاویہ زیادہ مستعمل ہے۔ حیران کن بات ہے' باوجود اس کے کہ زاویہ ایک خاص اسم ظرف مکان ہے شمالی افریقہ کا، لیکن اندلس کے زمانے میں اندلس کی سرزمین پر زاویے نہیں تھے۔ تیونس، الجزائر میں رباط تھے۔ یہاں صوفی لوگ بیٹھ کر لوگوں کو، آنے جانے والوں کو ایک چھت فراہم کرتے تھے۔ رہنے کے لیے جگہ دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی، پانی دیتے تھے۔ کچھ دیر لوگ بیٹھتے تھے۔ دکھی لوگ آتے تھے۔ اپنا دکھ بیان کرتے تھے اور ان سے شفا حاصل کر کے ڈائیلاگ کرتے تھے۔ سچ مچ! جو سائیکالوجسٹ کہا کرتے ہیں، وہ مہیا کرتے تھے، ہم نے بھی اسی تقلید میں پروگرام کا نام زاویہ رکھا ہے۔ اس لحاظ سے تو مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے۔ نقل بمطابق اصل ہے لیکن سپرٹ (روح) اس کی وہی ہے۔ کوشش اس کی یہی ہے کہ اس طرح کی باتیں یہاں ہوتی رہیں اور طبیعت

کا بوجھ، جو اور پروگراموں میں اور کالموں اور کتابوں سے دور نہیں ہوتا، وہ کسی طور پر یہاں دور ہو سکے۔

آپ جب بھی کسی ڈیرے پر، کسی بزرگ سے ملنے کے لیے جائیں گے تو آپ کے لاشعور میں ٹیسٹ کا ایک میٹر (Meter) ضرور ہوگا۔ میں دیکھوں، یہ کیسا آدمی ہے؟ آپ اکثر یہ کہہ کر چلے آتے ہیں کہ یار وہاں گئے تھے، وہ تو کچھ نہیں ہے۔ اپنے معیار کے ساتھ آدمی چیک کرتا ہے، لیکن جب آپ پوری طلب کے ساتھ، امتحان پاس کرنے کا انداز اختیار کیے ہوئے جائیں تو پھر آپ کو ان خاکستروں میں سے عجیب قسم کے لعل مل جاتے ہیں۔ مشکل تو ہوگی کہ وہاں سندھ چلے جائیں۔ تھر پار کر کے ڈیزرٹ میں چلے جائیں یا روہی میں چلے جائیں۔ کچھ نہ کچھ آپ کو دانش کی بات مل جائے گی۔ دانش کی بات جو ہے، یہ ایسے ہی لوگوں سے ملتی ہے، کتابوں سے نہیں ملتی۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ زاویہ، باوجود اس کے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے لیکن اس کی خوبی اس کی سپرٹ ویسی ہی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سپرٹ سے یاد آیا کہ اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں ایک بہروپیا آیا اور اس نے کہا: "باوجود اس کے کہ آپ رنگ ورامش، گانے بجانے کو برا سمجھتے ہیں، شہنشاہِ معظم! لیکن میں فن کار ہوں اور ایک فن کار کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا ہُوں اور میں بہروپیا ہُوں۔ میرا نام کندن بہروپیا ہے اور میں ایسا بہروپ بدل سکتا ہُوں کہ شہنشاہِ معظم، جن کو اپنے تبحرِ علمی پر بڑا ناز ہے، دھوکا دے سکتا ہوں، اور میں غچہ دے کر بڑی کامیابی کے ساتھ نکل جاتا ہوں۔

اورنگ زیب عالمگیر نے کہا: "یہ بات تو ضیعِ اوقات ہے۔ میں تو شکار کو بھی کارِ بیکار سمجھتا ہوں۔ یہ تم جو چیز میرے پاس لائے ہو، اس کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

اس نے کہا: "نہیں صاحب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ اتنے بڑے شہنشاہ ہیں اور دانش میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں بھیس بدلوں گا، آپ پہچان کر دکھایئے۔"

تو انہوں نے کہا: "منظور ہے۔"

اس نے کہا: "حضور آپ وقت کے شہنشاہ ہیں۔ اگر تو آپ نے مجھے پہچان لیا تو میں آپ کا دینے دار ہُوں۔ لیکن اگر آپ مجھے پہچان نہ سکے اور میں نے ایسا بھیس بدلا تو میں آپ سے پانچ سو روپیہ لوں گا۔" ظاہر ہے اس وقت پانچ سو بہت ہوں گے۔ شہنشاہ نے کہا: "ٹھیک ہے۔ پانچ سو میرے لیے کچھ نہیں ہے، منظور ہے، جاؤ۔" تو وہ شرط طے کر کے چلا گیا اور پھر سوچنے لگا۔ گھر جا کر بھی پریشان ہوا کہ میں شیخی میں ایسی شرط بد کر آ گیا ہوں۔ میں کون سا ایسا روپ بدلوں کہ بادشاہ کو پتا نہ چلے۔ پھرتا پھراتا تحقیق وتفتیش کرتا رہا۔ لوگوں سے پتا چلا اورنگ زیب عالمگیر ساؤتھ انڈیا میں مرہٹوں پر اور بہمنی سلطنتوں پر اکثر حملے کیا کرتا تھا۔ انہوں نے کہا، یہ سال چھوڑ کر اگلے سال پھر ان پر حملہ کرے گا۔ یہ خبر

بہروپیے کو جو وقائع نگار تھے، انہوں نے بتائی۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ چنانچہ وہ یہاں سے پا پیادہ سفر کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں بہمنی سلطنت تھی۔ وہاں جا کر اس نے ایک بزرگ کا روپ دھارا۔ ڈاڑھی بڑھالی۔ سبز کپڑے پہن لیے۔ بڑے بڑے منکے گلے میں ڈال لیے، اور اللہ کی یاد میں ایسا مستغرق ہوا کہ بڑی دیر تک بہت دور تک لوگوں کو اپنے اس سحر میں مبتلا کرتا رہا۔ اردگرد کے لوگ جو تھے، بابا پیر کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ لوگ آنے لگے اور طرح طرح کے چڑھاوے چڑھانے لگے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کا رواج ہے۔ دور دور تک اس کا نام آنے لگا۔ لیکن وہ بڑی استقامت کے ساتھ سال بھر اس ریاضت میں مصروف رہا جو بزرگ کیا کرتے ہیں۔

ایک سال کے بعد جب اپنا لاؤ لشکر لے کر اورنگ زیب عالمگیر ساؤتھ انڈیا پہنچا اور پڑاؤ ڈالا تو تھوڑا سا وہ خوف زدہ تھا۔ اور جب اس نے مرہٹوں کے پیشوا پر حملہ کیا تو وہ اتنی مضبوطی کے ساتھ قلعہ بند تھے کہ اس کی فوجیں توڑ نہ سکیں۔ پریشانی کا عالم ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ شاید اس کو ناکام لوٹنا پڑے اور اس کی حکومت پر بُرا اثر پڑے۔ چنانچہ لوگوں نے کہا، یہاں ایک درویش ولی اللہ رہتے ہیں درخت کے نیچے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے جا کر ڈسکس کریں۔ پھر دعا کریں اور پھر ٹوٹ پڑیں۔ شہنشاہ پریشان تھا، بے چارہ بھاگا بھاگا گیا اُن کے پاس۔ سلام کیا۔ اور کہا: "حضور میں آپ کی خدمت میں ذرا....." انہوں نے کہا: "ہم فقیر آدمی ہیں۔ ہمیں ایسی چیزوں سے کیا لینا دینا۔" شہنشاہ نے کہا: "نہیں عالم اسلام پر بڑا مشکل وقت ہے (جیسے انسان بہانے کیا کرتا ہے) آپ ہماری مدد کریں۔ میں کل اس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو فقیر نے فرمایا: "نہیں کل مت کریں، پرسوں کریں اور پرسوں بعد نمازِ ظہر۔" اورنگ زیب نے کہا جی بہت اچھا۔ چنانچہ اس نے بعد نمازِ ظہر جو حملہ کیا اور ایسے زور کا کیا اور جذبے سے کیا اور پیچھے فقیر کی دعا تھی، اور ایسی دعا کہ وہ قلعہ ٹوٹ گیا اور فتح ہو گئی۔ مفتوح جو تھے وہ پاؤں پڑ گئے۔ بادشاہ مرہٹوں کے پیشوا پر فتح مند کامران ہونے کے بعد سیدھا درویش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجود کہ وہ ٹوپیاں سی کے اور قرآن لکھ کر گزارا کرتا تھا لیکن سبز رنگ کا بڑا سا عمامہ پہنتا تھا بڑے زمرد اور جواہر لگے ہوتے تھے۔ اس نے جا کر عمامہ اتارا اور کھڑا ہو گیا۔ دست بستہ کہ حضور یہ سب کچھ آپ ہی کی بدولت ہوا ہے۔

اس نے کہا: "نہیں جو کچھ کیا اللہ نے کیا ہے۔" انہوں نے کہا کہ آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں حضور۔ درویش نے کہا: "نہیں ہم فقیر لوگ ہیں۔" اس نے کہا کہ دو پرگنے کی معافی دو بڑے قصبے۔ اتنے بڑے جتنے آپ کے اوکاڑہ اور پتوکی ہیں۔ وہ ان کو دیتا ہوں اور زمین اور آئندہ پانچ سات پشتوں کے لیے ہر طرح کی معافی ہے۔

اس نے کہا: "بابا یہ ہمارے کس کام کی ہیں ساری چیزیں۔ ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ تیری بڑی

مہربانی۔'' اورنگ زیب نے بڑا زور لگایا، لیکن وہ نہیں مانا اور بادشاہ مایوس ہو کے واپس آ گیا۔ اس نے اپنے تخت کے اوپر متمکن ہو کر ایک نیا فرمان جاری کیا۔ جب شہنشاہ فرمان جاری کر رہا تھا، عین اس وقت کندن بہروپیا اسی طرح منگتے پہنے آیا۔ شہنشاہ نے کہا:

''حضور آپ یہاں کیوں تشریف لائے۔ آپ مجھے حکم دیتے، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔'' کندن نے کہا: نہیں شہنشاہِ معظم! اب یہ ہمارا فرض تھا، ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو جنابِ عالی میں کندن بہروپیا ہوں۔ میرے پانچ سو روپے مجھے عنایت فرمائیں۔''

اس نے کہا: تم وہ ہو؟ اس نے کہا، ہاں وہی ہوں جو آج سے ڈیڑھ برس پہلے آپ سے وعدہ کر کے گیا تھا۔

اورنگ زیب نے کہا: ''مجھے پانچ سو روپیہ دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں، جب میں نے آپ کو دو پرگنے اور دو قصبے کی معافی دی۔ جب آپ کے نام اتنی زمین کر دی۔ جب میں نے آپ کی سات پشتوں کو یہ رعایت دی کہ اس میری مملکت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں رہیں۔ آپ نے اس وقت کیوں انکار کر دیا۔ یہ پانچ سو روپیہ تو کچھ بھی نہیں۔''

اس نے کہا: ''حضور بات یہ ہے جن کا روپ دھارا تھا، ان کی عزت مقصود تھی۔ وہ سچے لوگ ہیں۔ ہم جھوٹے لوگ ہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا تھا کہ روپ سچوں کا دھاروں اور پھر بے ایمانی کروں۔''

تو خواتین و حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارا یہ زاویہ دو نمبر ہی سہی، بے شک بہروپ ہی سہی، تو آپ دعا کریں۔ اس میں کچھ ایسی باتیں، کچھ ایسے مسئلے، کچھ ایسی پیچیدگیاں، کچھ ایسے بوجھ دور ہوتے رہیں جو کسی اور طرح سے نہیں ہو پاتے۔

زاویہ کے پہلے پروگرام میں حاضرین کے جناب اشفاق احمد سے کچھ سوالات اور ان کے جوابات:

سوال: اس طرح کی نشست تو رورل ٹریڈیشن ہے ہماری۔ یہ بھی اسی کا ایک سلسلہ ہے۔ پرنٹڈ ورڈ (Printed Word) نے اس کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

جواب: ہاں یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ Oral Tradition طاقتور ہے۔ پیغمبروں کا علم عام کرنے کے لیے Oral Tradition ہی ہوتی ہے۔ پیغمبر بھی کھڑے ہو کر اپنی بات بیان فرماتے تھے۔ اسی لیے اللہ قرآن میں بار بار ہر پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے: ''اے لوگو! دیکھو'' اور اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے۔ یہ تو بازاروں میں کھڑا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں سے باتیں کرتا ہے۔ فرعون نے بھی یہ کہا تھا کہ میں موسیٰ کو کیسے مان لوں، اس کے بازوؤں میں تو کنگن بھی نہیں ہیں۔ تو میں نہیں مانتا۔ Oral Tradition بالکل Oral ہی چلا اور میں یہ سمجھتا ہوں، میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ یہ Oral Tradition

پرنٹڈ ورڈ کے راستے سے ہو کر الیکٹرانک میڈیا کی معرفت Oral Tradition میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ہونا چاہیے' بشرطیکہ اس کا روپ بہروپ ویسا ہونا چاہیے جس طرح ابتدائی قدیم زمانے سے ہے۔

سوال: ماڈرن ورشن میں میں سمجھتا ہوں اس کا روپ یقیناً ہوگا۔ لیکن یہ ہیومین Presence کی بات ہے۔ جو عوام تھے، Oral Tradition میں موجود تھے۔ اس کو ہم کیسے ریوائیو (Revive) کریں۔

جواب: اس کو ہم Revive کر سکیں گے۔ بالکل دوبارہ جنم دینے سے کر سکیں گے۔ جہاں انسان انسان سے ملے گا۔ انسان انسان سے بات کرے گا۔ ورنہ ہم اپنی ہر سوچ کو (Realize) کرتے ہی رہ جائیں گے۔

سوال: سر! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جب ہم کسی شخص کو Condemn کرتے ہیں یا اس کا بطلان کرتے ہیں یا کسی شخص کو برا بھلا کہتے ہیں تو کیا ہمارے ذہن میں یہ آرزو تو نہیں پوشیدہ ہوتی کہ ہم خود ویسا بننا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ حسین آدمی کو کم حسین آدمی رد کرتے ہیں۔ امیر آدمی کو کم امیر آدمی رد کرتا ہے۔ طاقت ور کم صحت مند کھلاڑی کو رد کرتا ہے تو کیا اس کے پیچھے کوئی ایسی آرزو تو نہیں ہوتی کہ کاش میں بھی ایسا بن جاتا۔

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یقیناً اس میں ہے۔ اگر کوئی محروم شخص ہے' کسی بھی اعتبار سے' تو پھر وہ کنڈم تو کرے گا، لیکن اس کی محرومی کے پیچھے کچھ اسباب ہیں کہ جو جائز نہیں ہیں، مناسب نہیں ہیں یا جس کو معاشرہ دور کر سکتا ہے یا کرنا چاہیے تو پھر اس کے کنڈم کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالص انسانی بات ہے کہ جو بنیادی محرومی ہے' کسی بھی حوالے سے' وہ ایک ری ایکشن (ردعمل) تو جنریٹ کرے گی، تو اب اس سے کیسے بچا جائے۔

سوال: بچنے کی بات بعد میں آتی ہے۔ کیسے پتا لگایا جائے کہ یہ شخص جس بات کا اظہار کر رہا ہے اس کے پیچھے عوامل جو تھے، وہ مختلف ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کو سچ مچ کنڈم کر رہا ہے۔ ان کے پیچھے یہ آرزو ہے کہ میں بھی ایسا ہوتا جب اس مقام پر بندہ پہنچتا ہے۔ اس مقام کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے ایکٹ نہیں کرے گا۔ وہ دوسرے نیچے اتار دیں گے۔ جو بندہ غریب ہوتا ہے، ویسا کام نہیں کرے گا تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ جب بندہ امیر ہوتا ہے، اس کے پاس پیسا آتا ہے، دولت آتی ہے۔ ویسا Behave نہیں کرے گا تو لوگ اس سے چھین لیں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ جب غریب تھا تو بہت اچھا ہوتا تھا۔ اللہ میاں نے اسے دولت دی ہے تو بہت غلط ہو گیا ہے۔

جواب: برخوردار! یہ آدمی جو امیروں کو Run down کر رہا ہے کہ دیکھو جی کتنا ظالم ہے۔

سوال: یہ سر! کہیں ایسا تو نہیں کہ حسد بول رہا ہو؟

جواب: حسد بھی بولتا ہے۔ اگر حسد بولتا ہے تو پھر وہ خود ہونا چاہتا ہے نا۔ میں ڈرتا ہوں۔

میرے منہ میں خاک۔ میں کہیں جرأت نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ مارکس کچھ اور تھا۔

کوئی بھی نظریہ آدمی جو دیتا ہے، کوئی فلسفہ ہے یا کوئی بات۔ اس کے پیچھے اصل محرکات کیا ہیں، اس بندے کی ذات کے اندر وہ کچھ اور ہی ہو سکتے ہیں۔ مطلب جو اس کے ظاہری نظریات ہیں، وہ بالکل مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً یہ بچپن کی محرومی اور شدید غربت مارکسزم کی طرف لے جاتی ہے یا کچھ اور وقت اس نے گزارا ہے۔ کسی اور طریقے سے تو ممکن ہے کہ وہ کوئی اور نظریہ اختیار کر لے تو اب وہ اس بندے کی سٹڈی بن جائے گی۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ جو اس نے پیش کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس کو الگ سطح پر جانچیں۔ آپ کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں اگر Human Dignity کو Ensure کر لیں، ہر آدمی کی عزت کو بحال کر دیا جائے تو پھر ایسی صورت حال بن جائے گی۔ پھر کنڈم کرنے کا سلسلہ کم ہو جائے گا۔

میرے خیال میں بھی کچھ کم ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود بھی ایک بے چینی تو انسان میں رہے گی۔ ہمیشہ رہے گی۔ مثلاً ایک بہت اچھا Player ہے۔ اچھی Game کھیلتا ہے۔ میں نہیں کھیل سکتا، میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے چاہیے کہ میں خوش ہوں۔ واہ جی واہ، کیا اچھا کھیلتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تو کچھ بھی نہیں، فضول ہے۔ اس میں کیا ہے۔

انسان میں اپنی کمزوریاں اور اپنے اندر جو خامیاں ہوتی ہیں، ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں جو ہے، وہ مجھ میں کیوں نہیں، تو ایک حسد کہہ سکتے ہیں یا انسان کی شخصی کمزوری کہہ سکتے ہیں۔ کچھ قدرتی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ قدرتی طور پر خوب صورت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ مارجن (Margin) لے کر آتے ہیں اور جس کے پاس مارجن نہیں، وہ کیا کرے؟ صورت کو ایک معیار بنا دیا گیا ہے۔ آدمی جتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا اس کا ظرف ہو جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو برداشت بھی کر لیتا ہے۔ سن بھی لیتا ہے۔ کنڈم بھی نہیں کرتا۔ اگر ایسی صورتِ حال پیدا کی جائے کہ ہر آدمی کو عزتِ نفس ملے۔ اس کو بڑا ہونے کا احساس دیا جائے تو پھر وہ کنڈم نہیں کرے گا۔

بڑا ہونے کے لیے جو لیور (Lever) آپ اسے عطا کر رہے ہیں، وہ عزت نفس کا ہے۔ دولت یا شہرت یا حسن ہی سب کچھ نہیں ہیں۔

ابھی تک تو ہماری سوچ کا جو رخ ہے، وہ ذرا سا مختلف ہے جس کی ہمیں پریکٹس ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آہستہ آہستہ جب یہ انٹرایکشن بڑھے گا جو آپ نے سوال کیا تھا، انسانی لیول کے اوپر اس کے اندر پہنچ کر سوچے۔

آپ کا بہت بہت شکریہ اور مہربانی کہ آپ تشریف لائے اور آپ نے اس پروگرام کو رونق بخشی۔ انشاءاللہ پھر بھی آپ کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

بچوں کی نفسیات

آپ سب کی خدمت میں میرا سلام پہنچے۔

بچے کی نفسیات کے بارے میں بہت سی دلیلیں ایک دوسرے کے متضاد بھی ملتی ہیں کہ یہ بچہ کام کرتا ہے یا نہیں کرتا، تو میرا اس سے کوئی ایسا تعارف نہیں تھا۔ اور میں سائیکالوجی کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتا تھا جتنا کہ میرے ہم سفر جانتے تھے۔ میرا یہ واقعہ 1952ء کا ہے اور یہ مجھے شہزادی فرمائش پر پھر یاد آ رہا ہے۔ بہت دیر کی بات ہے۔ میں 1952ء میں ملک روم میں تھا۔ روم یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ساتھ ساتھ فرانسیسی اور اطالوی پڑھتا تھا۔ وہاں پر ہمارا ایک دوست تھا مسودی ریاک۔ وہ بہت اچھا مصور تھا۔ میری بہت اچھے سے مراد یہ کہ اس کی تصویریں گاہے بگاہے بک جاتی تھیں اور وہ ہمارا دوست تھا۔ دوست تھا تو اس کے ساتھ اِدھر اللے تللے کرنے میں روم میں گھوم پھر لیتا تھا۔ وہ اچھا شریف آدمی تھا۔ ہمیں بہت آسانی ہوتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ پیسے ہوتے تھے۔ ہم تین دوست تھے۔ ریاک، میں اور ایک ہری چند، جو ہندوستان کا تھا۔ ہم اس تاڑ میں رہتے تھے کہ کوئی اچھا سا موقع ہمیں ایسا ملے کہ جہاں پر ہم پیسے خرچے بغیر گھوم سکیں اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ پتا نہیں کتنی دیر یورپ میں رہنا ہے۔ تو ان دنوں 31 دسمبر 1952ء کو ریاک کی ایک تصویر بک گئی تو اس نے کہا، میں تمہاری دعوت کروں گا۔ ویا وینی تو کے اوپر، جہاں پر ایمبیسیز ہیں۔ بہت قیمتی سڑک ہے جیسے ہمارے ہاں شارع قائد اعظم ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں جس کا نام علی بابا چالیس چور تھا۔ وہ ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ تھا۔ ایک بیسمنٹ میں۔ ریستوران میں بڑے خوبصورت چالیس مرتبان تھے، ستونوں کی جگہ بنے ہوئے۔ اور اس کے اوپر چھت اٹھائی ہوئی تھی اور اس کے اندر آرکسٹرا بڑا خوب صورت بجتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہاں عام طور پر ایکٹر لوگ زیادہ جاتے تھے۔ عام آدمی کی وہاں اتنی پہنچ نہیں تھی کہ وہاں پہنچ سکتا یہ جو ہمارا انتھونی کوئن تھا، اس کو وہاں آنے کا بہت شوق تھا۔ انتھونی کوئن کی ایک بڑی عجیب وغریب عادت تھی کہ عورتوں جیسا مزاج تھا اُس کا۔ ہر وقت اپنے ساتھ ایک شیشہ رکھتا تھا، دو

منٹ بعد نکال کے تھوڑی لپ سٹک لگاتا تھا۔ اتنا نازک مزاج اور یوں کر کے بال۔ انتھونی کوئن سے ہم بہت متاثر تھے۔ وہاں کے لوگ بھی متاثر تھے۔ اور پھر اس سے وہاں ملنا ہُوا۔ انہی دنوں ہمارے مشرقی پاکستان کے ربیع الدین وہاں پر فلم ڈائریکشن کی کچھ تعلیم لینے آ گئے۔ ہماری ایوننگ کلاسیں ہوتی تھیں، اس لیے میں انہوں نے کہا، چھ مہینے کا کورس ہے اس میں آپ کو پتا چلے گا کہ ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ لائٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ تو چینی چتا ہم جانے لگے۔

ہمارے جو استاد تھے، پرنسپل تھے، ریکٹر تھے وہ تھے وکٹوریہ ڈیسیکا۔ ان کی ایک بہت مشہور بائیسکل تھی۔ تو ڈیسیکا صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن ہم ڈیسیکا صاحب سے نہ تو اتنا ڈرتے کیونکہ ان کا مزاج اچھا نہ تھا، اور نہ ان سے اتنے زیادہ متاثر تھے جتنے ان ایکٹروں سے جن کا کہ پینترا اور طرح کا تھا۔ تو ایک دفعہ انہوں نے ہم سے کلاس میں سوال پوچھا: ''بھئی بتاؤ کہ سب سے زیادہ مشکل رول کون سا ہے جو ایکٹر کر سکتا ہے؟'' مجھے بات یاد آ گئی۔ ہم سب نے ہاتھ کھڑے کیے تقریباً لڑکے لڑکیوں کا مشترکہ جواب تھا کہ ہنچ بیک آف نوٹرے ڈم بہت مشکل رول ہے۔ تو استادِ محترم نے فرمایا، دنیا میں سب سے آسان رول ہنچ بیک آف ناسٹرڈم کا رول ہے۔ کیونکہ ٹوٹی ہوئی ناک، گندی شکل، بدنصیب آدمی، ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ، وہ رول تو کوئی بھی آدمی کر سکتا ہے۔ وہ تو سب سے آسان ہے۔ ہنچ بیک آف نوٹرے ڈم، اگر کسی نے کیا ہے تو آپ اسے بڑا ایکٹر نہ مانیں۔ مشکل ترین رول یہ ہے کہ عام گھرانے کا ایک عام باپ ہے۔ ٹوپی اتار کے رکھتا ہے، چھتری پکڑ کر رکھتا ہے۔ دفتر سے آتا ہے اور پھر اس کو اپنا رول کرنا ہے جو سب سے مشکل ہے۔ وہ کیا کرے، اس کے پاس کوئی سہارا نہیں؟

یہ بات دوسری طرف چلی گئی، تو ہم چلے گئے علی بابا چالیس چور والے ریسٹورنٹ میں۔ 31 دسمبر کی رات میں تمہاری وہاں لگواؤں گا، اور تم دیکھو گے کہ دن کس طرح طلوع ہوتا ہے اور سال کس طرح ختم ہوتا ہے۔ کیا کیا کچھ ہنگامہ ہوتا ہے۔ ہم بڑے خوش تھے۔ ہم وہاں چلے گئے تو جا کے جب دیکھا تو چھما چھم بینڈ باجے بج رہے ہیں اور دنیا جہاں کے ایکٹرا یکٹرس آئے ہوئے ہیں۔ سارے تقریباً وہاں پر موجود تھے اور وہ بڑا اچھا زمانہ تھا۔ جب پوسٹ وار اسکل میں اٹلی کی بن رہی تھیں عمارتیں، جب وہاں گئے تو وہاں سٹیج کے اوپر بلیک نیگرو تھے۔ اس زمانے میں بلیک ڈرمر کا بہت رواج تھا۔ اب نہیں رہا۔ بیٹ بہت پیاری تھی۔ ہر ایک کا ناچنے کو دل کر رہا تھا۔ اچانک ریاک اٹھا، ہم سمجھے شائد کوئی اپنی چیز ڈرنک' کوئی سگریٹ لینے گیا ہے۔ جا کر اُن سے ملا، میوزک والوں سے۔ پھر لوٹ کر واپس آ گیا تو اچانک ایک اعلان ہوا۔ سینوری سینوری بونیرا چے اون کانٹن تے پاکستان وترادی نصرالی میں تو یہی سمجھا کہ ہمارے درمیان کوئی پاکستانی موجود ہے جو بڑا اچھا گاتا بجاتا ہے۔ میں نے